موجودہ دور میں دین اور اخلاقی تبدیلیاں

مؤلف: ڈاکٹر رمضان مہدوی آزاد نبی
مترجم: ڈاکٹر محمد جعفر

سبھی ادیان تین بنیادی موضوعات یعنی خدا، دنیا اور انسان کے بارے میں اپنی تعلیمات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ، اخلاقی اقدار کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اور مطلوبہ اخلاقی تبدیلیوں کو ہمیشہ اپنا ہدف قرار دیتے ہیں۔ اسلامی متون اور بالخصوص قرآن کریم نے پیغمبروں کو دی جانے والی ذمہ داریوں کو دو مقولوں میں بیان کیا ہے اور وہ تعلیم اور اخلاق (تزکیہ) ہیں۔ تزکیہ نفس اور اخلاق، انسانوں کو مطلوبہ تبدیلیوں کی طرف دعوت دینے کے معنی میں ہی دین اور پیغمبروں کا اصلی کام رہا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں جو سوال اٹھایا گیا ہے وہ موجودہ دور میں مذکورہ مقصد کی افادیت ہے۔ موجودہ دور اپنی ٹکنالوجی کے باعث عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل ہوگیا ہے، گویا ایک شیشہ کا مینار ہے جو ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے۔ اس شیشہ جیسی دنیا کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ اس نے انسانوں اور مختلف ثقافتوں کے درمیان پائے جانے والے سیاسی و طبیعی موانع و حدود کو ختم کر دیا ہے۔ کیا اس کے باجود موجودہ زمانے میں اخلاقی تبدیلی کے بارے میں گفتگو کی جاسکتی ہے؟ زیر نظر مقالہ میں، دینی انسان شناسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اخلاقی تبدیلیوں کی ایجاد میں اخلاقی اقدار کے فائدہ مند ہونے کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ مطلوبہ تبدیلی کے حصول کے لئے اخلاقی اقدار پر توجہ دینا، قرآن کریم میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ انسان کے اندر اخلاقی تبدیلی لانا، خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کا اہم کام رہا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ ترجمہ: پروردگار ان کے درمیان ایک رسول کو مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے۔ انہیں کتاب و

حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے۔ بے شک تو صاحبِ عزّت اور صاحبِ حکمت ہے۔[۱]

پیغمبر اکرمؐ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اخلاقی اقدار و مکارم کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں[۲]۔ دین پر ہونے والے بعض انتقادات اور اعتراضات، اخلاق کو اپنا نشانہ بناتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے وقوع کے ساتھ ہی اخلاقی اقدار پر نئے نئے اعتراضات ہونے لگے۔ علمی ترقی کی وجہ سے علم زدگی کی وبا عام ہو گئی جس کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار کی تکذیب یا تردید کی جانے لگی۔ انیسویں صدی میں اس طرح کی طرز فکر اپنے عروج پر تھی۔ اسی دور میں ڈارون کا نظریہ ارتقا پیش ہوا۔ یہ نظریہ بعض پہلوؤں سے اخلاقی اقدار سے مرتبط ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والے بہت سے لوگ استدلال کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے صحیح ہونے کی صورت میں اخلاقی اقدار کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔[۳]

ڈارون کا کہنا ہے کہ اسے اس بات پر تعجب ہے کہ طاقتور کس طرح کمزور کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے کیونکہ اس سے کمزور لوگوں کے ختم ہونے کا عمل سست ہو جاتا ہے[۴]۔ اسی طرح علم اور دین کو مستقل تصور کرنا اور حیات بشری میں رونما ہونے والی اخلاقی اور تربیتی تبدیلیوں کو علمی تصور کرنا یہ ایک الگ چیلنج ہے[۵]۔ بیسویں صدی عیسوی میں فلسفی حضرات نے علم اور دین کے درمیان رابطہ پر تحقیق کی جس کے نتیجہ میں مختلف نظریات سامنے آئے۔[۶] دین سے علم کے مستقل ہونے کی نفی کرنے کو علم کے بارے میں ایک فلسفی تفکر تصور کیا جاسکتا ہے۔[۷]

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۲۹

۲۔ اس بارے میں پیغمبر اکرمؐ کی یہ حدیث غور و فکر کے قابل ہے: انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، مجھے اسی لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اخلاقی مکارم کو کمال تک پہنچا سکوں۔

3۔ Gold, Stephen , Ever Since Darwin, p.12

4۔Darwin,Charles, The Decent of Man, p.180

5۔Hirst, P.H., Moral Education in a Secular Society, p.86

۶۔ ایان باربور، علم و دین، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، ص ۱۴۳

7۔ Goldman, Alvin, Knowledge in a Social World 1999, p.238

زیر نظر مقالہ میں جو سوال کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آیا موجودہ زمانے میں دین کے اخلاقی کردار کی افادیت باقی ہے یا نہیں۔ موجودہ زمانہ اپنی صنعتی اور تکنیکی ترقی کے باعث عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل ہو چکا ہے[1] اور ایسا لگتا ہے کہ دین کے اخلاقی کردار کو مختلف چیلنج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عالمی گاؤں کا خاصہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں اور مختلف ثقافتوں کے درمیان پائے جانے والے سیاسی و طبیعی موانع و حدود کو ختم کر دیا ہے۔ کیا اس کے باجود، یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین، اخلاقی اقدار کے ذریعہ مطلوبہ تبدیلیوں کی طرف دعوت دے سکتا ہے؟

موجودہ زمانے میں سرحدوں کے خاتمہ کے سبب بہت سے ایسے مفاہیم کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے جو گذشتہ زمانے میں اقدار کے لحاظ سے بہت ہی اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں سے ''دوری''، ''نزدیکی''، ''مجاز'' اور ''ممنوع'' جیسے الفاظ کا مفہوم قابل ذکر ہے[2]۔ ایسے حالات میں یہی مسئلہ درپیش آتا ہے کہ کیا دین انسانوں کو مطلوبہ تبدیلیوں کی طرف دعوت دے سکتا ہے جو غالبا مذکورہ مفاہیم سے مرتبط ہیں؟

بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ دین اس عالمی گاؤں کے دور میں کوئی بھی اخلاقی کردار ادا نہیں کر سکتا ہے اور دین کے اخلاقی کردار کا دفاع کرنے کے بجائے ہمیں پہلے اس کے زوال کے بارے میں گفتگو کرنی چاہیے۔ درحقیقت اگر ان لوگوں کے استدلال پر غور کیا جائے جو اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ زمانے میں اقدار کی تبدیلی ناممکن ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی مغالطے کا شکار ہوگئے ہیں جسے انیسویں صدی میں اخلاقی اقدار کے خلاف استدلال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس صدی میں ڈارون کے نظریہ کے نتیجہ میں، ارتقائی اخلاق کا ظہور ہوا جس کی بنیاد پر رائج اخلاقی نظام اور اس قانون کے درمیان ایک واضح تعارض پایا جاتا تھا جو ارتقا کے سبب املاء اور تجویز کیا گیا تھا۔ اس گروہ کا عقیدہ تھا کہ اخلاقی اقدار کی بنیاد پر عمل کے لیے ایک ایسی روش کا اختیار کرنا ضروری ہے جو ہر طرح سے ارتقا کے خلاف ہو کیونکہ ارتقا، سب سے موزوں کی کامیابی اور غلبہ کو بیان کرتا ہے[3]۔ اس تعارض کا سرچشمہ، اخلاقی ارتقا کا نظریہ ہے جو ایک ضمنی اور مفروضہ

1۔ Swami, Jitatmanand, Science Ethics 1999, p.2

۲۔ باقری، خسرو، نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، ص ۵۹

3۔ Huxley, Thomas, Evolution and Ethics, p.83

عقیدہ ہے۔اس لیے ارتقا کا دفاع کرنے والوں کے نظریے کے مطابق، انسان صرف ژن (Gene) کو تکثیر کرنے والی ایک مشین ہے جس کے ذریعہ صرف نسلوں میں اضافہ ہوتا ہے۔[1] موجودہ زمانے میں دین کے اخلاقی کردار کے مخالفین کا نظریہ بھی ویسا ہی کمزور نظر آتا ہے: انسان کے بارے میں نادرست تصور۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عالمی گاؤں اور دین کے اخلاقی کردار کے مابین تعارض کے نظریہ کی کمزوری کا سرچشمہ انسان کی نادرست شناخت ہے۔انسان شناسی کے مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے دینی اقدار کے کردار کا موجودہ زمانے میں دفاع کرنا آسان ہوسکتا ہے۔یہاں پر اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح انسان کے بارے میں مختلف تصورات اس سوال کے جواب پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

کیا موجودہ زمانے میں دین اقدار کے میدان میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔اگر اس سوال کا جواب ہم نفی میں دیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم انسانی جسم کے اصالت کے قائل ہیں۔اس نظریہ کی وجہ سے انسان کے بارے میں مکینیکل (Mechanical) تصور سامنے آتا ہے۔پوری تاریخ میں دینی و الحادی انسان شناسی کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مرتبط بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مد مقابل بھی: ایک نظریہ نے انسان کو جسم تک محدود قرار دیا ہے (یعنی جسم کی اصالت) اور دوسرا نظریہ انسان کی اخلاقی سرنوشت کو حیوان کے ساتھ یکساں قرار دیتا ہے۔

انسان کو جسم تک محدود کرنے والے نظریہ کے مطابق انسان ایک مشین ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی تبدیلی، مادی دنیا پر حاکم اصولوں کی تابع ہوگی جب کہ غیر مشینی تصور میں کسی بھی طرح کی تبدیلی خاص اصول و قوانین کے مطابق ہوگی۔اگر انسان کو جسم تک محدود کیا جائے گا تو اس میں اخلاقی تبدیلیوں کا امکان اسی وقت ہوسکتا ہے جب مادہ اپنے اصول و قوانین کو بروئے کار لائے۔ایک دوسرے کے قریب ہونا، ایک دوسرے سے رابطہ میں ہونا اور متناسب قربت و دوری، تبدیلیوں کی ایجاد میں دخیل ہیں۔اس تصور کے ساتھ اقدار کے روایتی نظام میں رائج کچھ مفاہیم جیسے دور، نزدیک وجائز اور ممنوع کی ضرورت قابل تصور ہوجاتی ہے لیکن اگر ہم انسان کو جسم تک محدود نہ کریں تو پھر اس کے اندر تبدیلیوں کا واقع ہونا مادہ کے اصول و قوانین کے مطابق نہیں ہوتا۔اس لیے اخلاقی تبدیلی کے لئے افراد کو نامطلوب

1۔ Dawkings,Richard, The Selfish Gene, p.2

ماحول سے ''دور'' کرنے کا کوئی اہم رول نہیں ہوتا اور اس طرح ''دور، نزدیک و جائز، ممنوع'' وغیرہ جیسے مفاہیم اخلاقی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتے اور پھر اقدار کے نظام میں یا تو کوئی اعتبار نہیں ہوگا یا اس کے معنی مادی اصول کے مطابق نہیں ہوں گے۔

بہر حال جسم کی اصالت کے نظریہ کے پیش نظر، یہ واضح ہے کہ ایک ہی شرائط و ماحول میں شرک و ایمان اور اخلاقی فضائل و رذائل کے تحقق کا امکان، قابل تصور نہیں ہے۔ انسان سے متعلق مشینی تصور کو مد نظر رکھا جائے گا تو انسانی اقدار میں ہونے والی تبدیلیاں ''دور و نزدیک'' وغیرہ جیسے مفاہیم کے تابع ہوں گی اور ایسی حالت میں دین کے اخلاقی کردار کی نفی موجودہ دور میں ایک واضح امر ہے کیونکہ اس نظریہ کے مطابق اخلاقی تبدیلیوں کے لیے سرحدوں کی ضرورت ہے جب کہ اس شیشہ کی مانند دنیا اور عالمی گاؤں میں سرحدیں ختم ہو چکی ہیں لیکن اگر ہم روح کی اصالت کو مان لیتے ہیں تو پھر اقدار میں تبدیلی کے لئے سرحدوں کی شرط ختم ہو جائے گی۔

اصالت روح کا نظریہ

گذشتہ گفتگو میں ہم نے آج کے عالمی گاؤں کے دور میں دین کے اخلاقی کردار کے بارے میں دو مختلف نظریات کو پیش کیا۔ ایک نظریہ کے لحاظ سے موجودہ دور دین کے اخلاقی کردار کے زوال کا دور ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان اور اخلاقی تبدیلی کے بارے میں مشینی تصور، موجودہ دور میں دین کے اخلاقی کردار کے زوال پذیر ہونے کے برابر ہے مگر یہ کہ فرد موجودہ دور کی مواصلاتی طاقت کے باعث پیدا ہونے والے ماحول سے خود کو محفوظ رکھ سکے، لیکن شاید ہی کوئی فرد ایسا کر سکتا ہو اور اس کے محقق ہونے کے لئے بہت مشقت کرنی پڑے گی۔ اور تمامتر کوششوں کے باوجود شاید اس کا کوئی مطلوب نتیجہ بھی برآمد نہ ہو، کیونکہ اس طرح کی تبدیلیاں شرایط کے بدلنے سے ختم ہو جاتی ہیں جب کہ اخلاقی تبدیلیوں کی ایک خصوصیت اس کا ہمیشہ باقی رہنا ہے۔

دوسرے نظریہ کے مطابق موجودہ دور کی مواصلاتی طاقت، دین کے اخلاقی کردار کے لئے چیلنج نہیں ہے کیونکہ اخلاقی تبدیلیوں کی ماہیت کا تعلق غیر مکینکل تحریک سے ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اگر انسان اور اخلاقی تبدیلیوں کی ماہیت کے بارے میں ہمارا تصور غیر مکینکل ہوگا تو دین کے اخلاقی کردار اور موجودہ دور کی مواصلاتی طاقت کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہوگا اور اس لحاظ سے دین کو کسی طرح کے چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اب یہاں پر سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے ان دونوں نظریوں میں سے کونسا قابل قبول ہے؟قرآن کریم اور اسلام کی بزرگ شخصیات، ان میں سے کس نظریے اور تصور کی تائید کرتی ہیں؟اخلاقی تبدیلی کی ماہیت جسمانی ہے یا غیر جسمانی؟ راقم الحروف کی نظر میں مذہبی نصوص (دینی متون) واضح طور پر انسان اور اخلاقی تبدیلیوں کے غیر مکینکل ہونے[1] کے تصور اور نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔

اسلامی دنیا اور اس سے کہیں زیادہ دوسرے مذاہب اور خاص کر عیسائیوں میں جو سب سے بڑی کمی پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم دینی مفاہیم کا غلط مطلب نکالتے ہیں جس کا مختلف ثقافتوں میں مختلف رد عمل ہوتا ہے۔عیسائیوں میں اس طرح کی غلطیوں کو اصل دین تصور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے فلسفی دین کے خلاف ہوگئے۔ان فلسفیوں میں نطشے(Nietzsche)، فرویڈ(Freud) اور رسل(Russell) کا نام قابل غور ہے۔ اسلامی ثقافت میں بھی بہت سے لوگوں نے (غلط تفسیر اور سمجھ کے ساتھ) روشن خیال بننے کی کوشش کی ہے۔

شہید مطہری نے اس طرح کی طرز فکر رکھنے والوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ زہد کے بارے میں نادرست تصور کی وجہ سے کچھ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ زہد اور طلب رزق کے لئے تگ و دو کرنے کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے جب کہ زہد خود ایسی قوت کا سرچشمہ ہے جس کی وجہ سے لوگ اور مؤثر طریقے سے معاشرہ میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ شہید مطہری اور دوسرے روشن خیال مفکروں میں فرق یہ ہے کہ جب ان کے سامنے زہد، توکل وغیرہ جیسے اسلامی مفاہیم کی غلط تفسیر پیش کی جاتی ہے تو آپ ان دینی مفاہیم کی تکذیب و تردید کے بجائے انہیں صحیح طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

شہید مطہری کی نظر میں زہد کی تعریف یہ نہیں ہے کہ انسان جتنا فقیر ہوگا اتنا ہی زیادہ زاہد ہوگا بلکہ زہد اور دولتمندی ایک ساتھ جمع بھی ہو سکتے ہیں۔زہد، بنگلہ یا جھونپڑا نہیں دیکھتا، کسی کے بھی اندر زہد

۱۔زیر نظر مضمون میں اسلامی ثقافت میں روح کی اصلیت کے بارے میں استدلال سے پرہیز کیا گیا ہے۔ صرف اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں انسان کے بارے میں روح کی اصلیت کی آیڈیالوجی کے ساتھ اخلاقی اقدار کا ذکر موجود ہے اور مناسب مطلوبہ اقدار کی تبدیلی کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ یہ آیڈیالوجی روح کا پھونکا جانا جیسی تعبیر کے ساتھ بلاواسطہ بیان کی گئی ہے اور موت کو توفی (یعنی کسی چیز کا دوسری چیز سے جدا ہو جانا) جیسے مفہوم سے یاد کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے۔ زہد علم و جہل بھی نہیں دیکھتا۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم گوشہ نشینی اور عزلت کے ذریعہ ایسے اقدار کے حصول کی تلاش کرتے ہیں جب کہ دوسرے انسانوں سے ہم آہنگ تعلقات بنائے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔

دینی متون میں نیت کو اخلاق کا سب سے اہم معیار مانا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی تبدیلی ایک مشینی عمل نہیں ہے یعنی معیار نیت ہے جو انسان کے سینہ میں پوشیدہ رہتی ہے۔ نیت یعنی وہ حدود جس کا صحیح ہونا اور غلط ہونا زمان و مکان کا محتاج نہیں ہوتا۔ نیت ہی روح کی پرورش کرتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو ذہنی مفہوم میں خطا کی صورت پیدا ہو جاتی ہے[۱]۔ چاہے گذشتہ زمانے میں ہو یا موجودہ زمانے میں ہو، چاہے اس دنیا میں ہو جہاں انسان ایک دوسرے سے بے خبر ہیں اور چاہے وہ شیشہ جیسی دنیا ہو جہاں انسان ایک دوسرے سے باخبر رہتے ہیں۔ ہر جگہ در حقیقت نیت ہی یہ معین کرتی ہے کہ اخلاقی تبدیلی واقع ہوئی ہے یا نہیں۔ امام صادقؑ نے نادرست نیت کو واقعی غفلت کے برابر قرار دیا ہے[۲]۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی فرمایا ہے:

"خداوند عالم تمہاری صورت اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دل اور کردار کو دیکھتا ہے"[۳]۔

اس نظریہ کے مطابق ہم اسی وقت اقدار میں تبدیلی کا دعوی کر سکتے ہے جب اپنے وجود کے اندر نیت کی لگام کو مضبوطی سے پکڑنے پر قادر ہوں۔ وہ مرتبہ جس میں سرحدیں نہیں ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں "الاعمال بالنیات"، عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے[۴]۔ نیت ہی اس بات کو واضح کرتی ہے کہ ہم روزہ و نماز کی حالت میں ہیں یا نہیں، بھوکا پیٹ اور جھکی ہوئی کمر اس بات کو واضح نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حضرت علیؑ شکم کے روزہ کے مقابلہ میں دل و زبان کے روزہ کے بارے میں بات کرتے ہیں[۵]۔

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، حکمت عبادات، ص ۷۲

۲۔ مصباح الشریعہ و مفتاح الحقیقہ (امام جعفر صادقؑ سے منسوب)، ص ۱۸

۳۔ نہج الفصاحہ، ص ۵۲۲

۴۔ ایضاً

۵۔ صوم القلب خیر من صیام اللسان و صوم اللسان خیر من صیام البطن

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ روزہ کی ماہیت کا اصل تعلق گویا اندرونی رکاوٹ وامساک سے ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام اقدار کی بنیاد، اس کی غیر مکینکل ماہیت ہے۔

خانہ کعبہ کے جوار میں سکونت اختیار کرنا یا پیغمبروں کے زمانے میں زندگی گزارنا، اقدار کی تبدیلی کے لیے کلیدی وجہ نہیں ہے۔ امام خمینیؒ کا یہ جملہ توجہ کے قابل ہے: "اگر تزکیہ نفس نہ ہو اور اس کی اصلاح نہ کی جائے تو علم تفسیر بھی خاصیت سے خالی ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے انسان کے لیے وبال جان بن جائے[۱]۔"

اخلاقی تبدیلی کی اس تصویر کی کچھ خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اگر یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ باقی رہے گی اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس تبدیلی کا تعلق فیزیکل تعلقات سے نہیں ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کوئی مسجد میں رہ کر بھی اس کے باہر ہو، اور مسجد کے باہر زندگی کی سرگرمیوں میں مصروف رہ کر بھی کسی کا شمار مسجد کے اندر بیٹھنے والوں میں ہو۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

> "الراضی بفعل قوم کالداخل فیه معهم و علی کل داخل فی باطل اثمان: اثم العمل به و اثم الرضی به۔ ترجمہ: جو شخص کسی قوم کے کام سے خوش ہوگا وہ ایسے ہی ہے جیسے ان کے ساتھ رہا ہو اور جس نے کسی باطل کا ساتھ دیا، اس کے اوپر دو گناہ ہوں گے: باطل کام کا گناہ اور باطل کے کام پر راضی رہنے کا گناہ[۲]۔"

اسی معیار کے تحت سنہ ۳۶ ہجری میں بصرہ کی جنگ میں کامیابی کے بعد جب ان کے ایک چاہنے والے نے یہ تمنا کی کہ اے کاش اس کا بھائی بھی اس جنگ میں موجود ہوتا تو امیر المومنینؑ نے فرمایا: اگر تمہارے بھائی کا دل ہمارے ساتھ ہے تو سمجھ لو وہ اس جنگ میں شریک تھا اور پھر آپ نے فرمایا حتی وہ لوگ جو اپنے باپ کے صلب اور اپنی ماں کے رحم میں ہیں وہ بھی اس جہاد میں شریک ہیں بشرطیکہ وہ ہمارے

۱۔ خمینی، روح اللہ، جہاد اکبر، ص ۱۶

۲۔ نہج البلاغہ، دشتی، خطبہ ۱۵۴

ہم عقیدہ ہوں[۱]۔

دوسرا نمونہ بھی موجود ہے جس میں غور و فکر کے نتیجہ میں اخلاقی تبدیلی کے غیر مکینکل تصور کی تائید ہوتی ہے اور وہ یاد الٰہی کا مسئلہ ہے۔ یادِ الٰہی خدا کی سب سے برتر عبادت تصور کی جاتی ہے[۲]۔ نماز کی اہمیت بھی اسی میں ہے کہ انسان نماز کی حالت میں خدا کی یاد میں مصروف رہے اور خدا کی یاد ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو ہر طرح کی مصیبت اور بند راستے میں استقامت و مبارزہ کی قوت عطا کرتی ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

''من کان ذاکرا علی الحقیقة فهو مطیع و من کان غافلا عنه فهو عاص''۔

ترجمہ: جو شخص سچے دل سے خدا کی یاد میں ہوتا ہے وہی خدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور جو شخص اپنے حالات اور کاموں میں خدا سے غافل ہوگا تو وہ گنہگار بندہ ہے[۳]۔

یاد الٰہی کی اہمیت و منزلت ایک ایسی مستقل بحث ہے جسے اخلاقی مصادر میں آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جو چیز استناد کے قابل ہے وہ یادالٰہی کے بارے میں قرآنی نگاہ ہے کہ یاد الٰہی کے زیور سے آراستہ ہونے کے لیے مکینکل طرز و تحریک اور ظاہر داری ضروری نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ کسی شخص کا جسم دوسروں کے مقابلہ میں (چھوٹا جرثومہ کی مانند) چھوٹا ہو اور وہ ان کے ساتھ انھیں تمام شرائط و حالات میں زندگی گزار رہا ہو لیکن اس کی (عالم اکبر[۴]) روح اس حالات و شرائط سے باہر ہو۔

سورہ نور اس لحاظ سے قابل غور و فکر ہے جس میں مومن افراد کی بعض صفات بیان ہوئی ہیں۔ مذکورہ سورہ میں یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ حقیقی مومن وہ لوگ ہیں جو تجارت اور معاملہ سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ تجارت اور معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرنا اہل ایمان کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تجارت اور یاد الٰہی دونوں کے ایک ساتھ جمع ہونے کو مومن کی ممتاز خصوصیت قرار دیا گیا ہے۔ تجارت اور معاملات ایک ایسا اقتصادی عمل ہے جس میں انسان کی توجہ سود و زیان کی طرف ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲

۲۔ نراقی، ملا احمد، معراج السعادۃ، ص ۶۸۴

۳۔ مصباح الشریعہ و مفتاح الحقیقہ، ص ۲۱

۴۔ حضرت علیؑ سے منسوب ایک شعر جس میں انسان کے بدن کو ایک چھوٹے جرثومے سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کی روح کو عالم اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہی چیز انسان کو یاد خدا سے غافل کرنے کا راستہ فراہم کردے لیکن جب اہل ایمان تجارت و معاملات کرتے ہو تو وہ یاد الٰہی کو اپنی جان کا زیور بنالیتے ہیں۔ مربی کے دور رہنے یا نزدیک رہنے کے بارے میں مذکورہ آیت میں بیان نہیں کیا گیا ہے لہٰذا قرآنی تعلیمات کی مدد سے ان میں سے بہت سے موارد کے غلط ہونے کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو دینی تربیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اور ان کے درمیان کوئی سازگاری نہیں پائی جاتی۔ مثال کے طور پر حدود و حصار کے ساتھ یونیورسٹیوں کو اسلامی کرنے کے تصور کو کس حد تک قرآنی اصول پر منطبق سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم کی نگاہ میں تجارت اور یاد الٰہی میں کسی طرح کا تعارض نہیں پایا جاتا۔ اسی دلیل کی بنا پر یونیورسٹیوں کے اسلامی کرنے کے تصور کے لیے ضروری نہیں ہے کہ مرد و زن کی تفکیک کی جائے۔

جسمانی (فیزیکل) علیحدگی اور اخلاقی تبدیلی

گذشتہ بحث میں مذہبی نصوص کے استناد کے ساتھ انسان اور اخلاقی تبدیلی کے غیر مکینکل تصور و نظریہ کا دفاع کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ انسان کے بارے میں غیر مکینکل تصور کے ماتحت، اقدار کی تبدیلی کے بے اعتبار ہونے میں دوسروں سے ہر طرح کی علیحدگی کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انفرادی اور اختصاصی طور پر اس بات کا امکان ہے کہ اقدار کی تبدیلیوں کا کچھ سلسلہ تنہائی اور ماحول سے دوری یا خاص افراد سے دوری کی وجہ سے وجود پا جائے۔ گذشتہ حصے میں اس بات پر تاکید تھی کہ موجودہ زمانہ کی مواصلاتی طاقت اور دینی اقدار کے کردار کے درمیان ناسازگاری کی نفی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ، دین کے لیے خوف کا باعث نہیں ہے لیکن اگر اس مسئلہ کو نفی مطلق کے معنی میں دیکھا جائے تو علیحدگی اور کورنٹین (Quarantine) کی تربیت کو مقدمہ کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس معنی میں ہوگا کہ دین میں تجویز کی گئی اخلاقی تبدیلی، مکنیکل مناظر کے درمیان روابط کے نظم و ضبط سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ اسی لیے دوری اور قربت کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی اخلاقی تبدیلی کا امکان پایا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ خاص شرائط میں علیحدگی اور کنارہ کشی اختیار کرنے کی تجویز پیش کی جاتی ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اقدار کی تبدیلی کی ماہیت کو مطلوب تبدیلی کے عمل کے عنوان سے جو دیرپا خصوصیت کا حامل ہو، اسے علیحدگی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا

جاسکتا۔اور جو کچھ اس طریقہ سے حاصل ہوگا وہ دیر پا نہیں ہوگا اور بہت آسانی کے ساتھ اس کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے[۱]۔

اخلاقی تبدیلی اور عقلانیت

اگر ہم دینی تعلیمات میں عقلانیت کے مقام و شان پر توجہ کریں گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ دینی اقدار کے کردار اور موجودہ زمانے کی مواصلاتی طاقت کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔عصر حاضر کا یہ تقاضا ہے کہ تمام معاملات منجملہ اخلاقیات میں بھی عقل کی بلا واسطہ دخالت ہو۔موجودہ زمانہ گذشتہ صدیوں کی طرح اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان عقل کو نظر انداز کرکے اخلاقی فضائل کو اپنے اندر سمیٹ سکے کیونکہ موجودہ دور کی مواصلاتی طاقت تمام ادوار کو نزدیک کرنے اور حدود و حصار کو ختم کرنے کے ذریعہ انسانوں کو مختلف اور متنوع فکری و عملی نمونوں سے روبرو کرتا ہے اور انسان اپنی قوت عقلانی کے استعمال کے بغیر ان میں سے کسی ایک طرز فکر کا انتخاب نہیں کرسکتا۔وسیع و عمیق اطلاعات و معلومات مختلف شکلوں میں دستیاب ہیں۔ایسے موقع پر صرف عقل کے ذریعہ کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔اب ہمیں مذہبی نصوص (دینی متون) کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام میں عقل کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔اگر دینی تعلیمات میں عقل کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے تو موجودہ زمانے میں اس نظام کا زوال پذیر ہونا بدیہی ہوگا لیکن اگر دینی تعلیمات میں عقلانیت کے عنصر پر زیادہ تاکید کی گئی ہے تو موجودہ زمانہ اس نظام کو ٹھیس نہیں پہنچاسکتا۔

عقلانیت اور شناخت و آگاہی میں فرق ہوتا ہے۔شناخت ایک ایسا عمل ہے جس میں انسان غالبا غیر فعال ہوتا ہے اور ذہن ایک صندوق کی مانند تمام معلومات کو اپنے اندر ذخیرہ کرلیتا ہے لیکن تفکر و عقلانیت ان جمع شدہ مواد کو تجزیہ و تحلیل کرتی ہے۔البتہ عقل و شناخت کو ہمیشہ ایک ساتھ ہونا چاہیے۔شہید مطہری اس بارے فرماتے ہیں کہ اگر انسان غور و فکر کرے لیکن اس کی معلومات کمزور ہوں تو وہ اس کارخانہ جیسا ہے جس میں خام مواد نہ ہو یا خام مادہ کی مقدار بہت کم ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کام نہیں کرسکتا یا

۱۔ بہت سے بزرگ انسانوں نے اخلاقیات میں علیحدگی اور تنہائی کے ذریعہ اخلاقی تبدیلی لاکر اپنے نفس کو مہار کرنے کی توفیق حاصل کی ہے۔

اس کا محصول بہت کم ہوگا۔ محصول کا دار و مدار خام مادہ کی رسائی پر منحصر ہوتا ہے اگر کارخانہ کے پاس خام مادہ کی مقدار زیادہ ہو لیکن وہ کام نہ کرے تب بھی یہی صورت حال ہے اور ایسی صورت میں محصول کا وجود ہی نہیں ہوگا[۱]۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں عقل و علم کی کیا اہمیت ہے ؟ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دینی کتابوں میں عقل کو سب سے بلند مرتبہ پر قرار دیا گیا ہے۔ علم کلام کے معروف عالم ہشام بن حکم نے امام موسیٰ کاظمؑ سے ایک روایت نقل کی ہے[۲] جس میں سورہ زمر کی بیسویں آیت کے ضمن میں مومن کی خصوصیات بیان کی گئی ہے۔ اس روایت کے مطابق خدا اپنے ان بندوں کو بشارت دیتا ہے جن میں دو خصوصیات ہوں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگ باتوں کو سننے والے ہوتے ہیں اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ گفتگو کو سننے کے بعد ان میں سے جو بہترین باتیں ہوتی ہیں ان پر عمل کرتے ہیں۔ انھیں لوگوں کو بشارت دی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ جب کسی کی بات سنتے ہیں تو ان کو کسی طرح کا خوف نہیں ہوتا بلکہ ایسی صورت میں بہترین فکری و عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اسی روایت میں امامؑ، ہشام سے فرماتے ہیں کہ خدا نے عقل کے ذریعہ اپنے بندوں پر حجت تمام کی ہے اس لیے عقل کو استعمال میں نہ لانا خود ایک طرح کا جرم تصور کیا جائے گا۔ روایت میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امامؑ نے ان لوگوں کو خدا کی سرزنش کا مستحق قرار دیا ہے جو عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی ۱۷۰ ویں آیت، امامؑ کی بات کی تائید کرتی ہے۔ اس آیت میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ ترجمہ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔

۱۔ مطہری، مرتضی، تعلیم وتربیت در اسلام، ص ۴۵

۲۔ اصول کافی، ج ۱

مذکورہ روایت میں دوسرے اہم مطالب بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن موضوع کی مناسبت سے ہم بیان شدہ نکات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے کچھ بندوں کو بشارت دیتا ہے اور کچھ لوگوں کی سرزنش کرتا ہے۔ بشارت اور سرزنش کا معیار عقل کے استعمال یا عدم استعمال پر منحصر ہے۔

اسلام ایک ایسا نظام جس میں تعقل کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور عقل اس کا اہم جز ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آج کے عالمی گاؤں کے نظام سے وہ صرف اس لئے میل نہ کھاتا ہو کیونکہ آج کے دور میں تعقل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ آج کے تعقل گرائی کے دور میں، دینی اقدار اور زیادہ بہتر طریقے سے سمجھے جاسکتے ہیں۔[1]

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- مصباح الشریعہ ومفتاح الحقیقہ، امام صادقؑ سے منسوب، ترجمہ وشرح: حسن مصطفوی، انتشارات قلم، ۱۳۶۳
- نہج البلاغہ، مترجم محمد دشتی، دفتر نشر الہادی، ۱۳۷۹
- نہج الفصاحہ، کلمات قصار رسول اکرمؐ، مترجم محسن شیر محمدی، انتشارات سایہ گستر و مہرگان دانش، ۱۳۸۶
- ثقۃ الاسلام کلینی، اصول کافی، ترجمہ وشرح: سید جواد مصطفوی، بنیاد رسالت ۱۳۶۴
- خمینی، روح اللہ، مبارزہ با نفس یا جہاد اکبر، انتشارات پیام آزادی
- مطہری، مرتضی، تعلیم وتربیت در اسلام، ناشر صدرا، ۱۳۶۷
- مطہری، مرتضی، علل گرایش بہ مادیگرایی، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۳۶۱
- مطہری، مرتضی، گفتارہای معنوی، انتشارات صدرا، ۱۳۷۰
- نراقی، ملا احمد، معراج السعادہ، ناشر ہما، ۱۳۷۱
- جوادی آملی، عبداللہ، حکمت عبادات، مرکز نشر اسراء، ۱۳۸۳
- مصباح، محمد تقی، فلسفہ اخلاق، انتشارات اطلاعات، ۱۳۷۶
- باقری، خسرو، نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، انتشارات مدرسہ، ۱۳۸۴

۱۔ تفکر و تعقل کی اہمیت واعتبار کے بارے میں بہت سی آیات وروایات موجود ہیں۔ تفکر کے بارے میں تمام روایات کا مطمح نظر یہی ہے کہ غور و فکر کرنا عبادت ہے۔

❖ ایان بار بور، علم و دین، مترجم بہاء الدین خرمشاہی، مرکز نشر دانشگاہی، ۱۳۷۴

❖ Dawkings, Richard, The Selfish Gene, 1989

❖ Gold, Stephen, Ever Since Darwin, London, 1977

❖ Holme, S.J., Evolution, Toronto, Canada: International Christian Crusade, 1959

❖ Darwin, Charles, The Decent of Man, London: P.F. Collier Son, 1902

❖ Goldman, Alvin, Knowledge in a social world, Clarndon press, 1999

❖ Contemporary philosophy of Religion, Taliaferro, Charles, Blackwell publisher inc. 1998

❖ Swami, Jitatmanad, Science Ethics and Holistic values, Bhartiya 1999

❖ Hisrt, P.H., Moral Education in a secular society, university of London press 1974